اتنا معلوم ہو جائے کہ یہ کسی فقیر کی دی ہوئی جڑی بوٹی ہے، پھر آپ کی خوشامد کریں گے، ناک رگڑیں گے اور آپ وہ چیز انھیں دے دیں تو سلا کے لئے آپ کے احسان مند بن جائیں گے ایک روپئے میں اگر دس بیس احمقوں پر احسان کا لمدہ کسا جا سکے تو کیا بُرا ہے؟ ذرا سے احسان سے بڑے بڑے کام نکل جاتے ہیں۔"

رائے صاحب نے شوق بھرے تعجب سے پوچھا۔" مگر ان بوٹیوں کے گن آپ کو یاد کیسے رہتے ہیں۔"

کھنا نے قہقہہ لگایا۔ آپ بھی رائے صاحب بڑے مزے کی بات کرتے ہیں۔ جس بوٹی میں جو گن چاہے بتا دیجئے، یہ آپ کی لیاقت پر منحصر ہے۔ صحت تو روپئے میں آٹھ آنے اعتقاد سے ہوتی ہے۔ آج جوان بڑے بڑے افسروں کو دیکھتے ہیں اور ان لمبی دم والے عالموں کو اور ان رئیسوں کو، یہ سب کورانہ اعتقاد والے ہوتے ہیں میں تو علم نباتات کے پروفیسروں کو جانتا ہوں جو ککروندے کے نام سے بھی واقف نہیں۔ ان عالموں کا مذاق تو ہمارے سوامی جی خوب اُڑاتے ہیں۔ آپ کو تو کبھی ان کے درشن نہ ہوئے ہوں گے۔ اب کے آئیں گے تو ان سے ملاؤں گا۔ جب سے میرے باغیچے میں ٹھہرے ہیں رات دن لوگوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ ہوس تو انھیں چھو بھی نہیں گئی۔ صرف ایک بار دودھ پیتے ہیں۔ ایسا عالم مہاتما میں نے نہیں دیکھا۔ نہ جانے کتنے برسوں تک ہمالیہ پر تپسیا کرتے رہے۔ پورے پہنچے ہوئے سادھو ہیں۔ آپ اُن کے مُرید ضرور

ہو جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی ساری پریشانیاں ہوا ہو جائیں گی۔ آپ کو دیکھتے ہی وہ آپ کا ماضی، حال، مستقبل سب کہہ سنائیں گے۔ ایسے ہنس مکھ ہیں کہ دیکھتے ہی دل شگفتہ ہو جاتا ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ خود اتنے بڑے مہاتما ہیں، مگر سنیاس، تیاگ، مندر اور مٹھ اور پنتھ ان سب کو ڈھونگ کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ رواجی بندشوں کو توڑو اور انسان بنو۔ دیوتا بننے کا خیال چھوڑ دو، دیوتا بن کر تم انسان نہ رہ جاؤ گے۔"

رائے صاحب کے دل میں شبہ ہوا۔ مہاتماؤں پر انھیں بھی پورا اعتقاد تھا جو ذی اقتدار لوگوں میں عموماً ہوتا ہے۔ دکھی دل کو دھیان میں جو تسکین ملتی ہے اس کے لئے وہ بھی للچاتے رہتے ہیں۔ جب مالی مشکلات کے سبب مایوس ہو جاتے تو دل میں آتا کہ دنیا سے منہ موڑ کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھیں اور نجات کی سبیل کریں۔ دنیاوی بندشوں کو وہ بھی عوام کی طرح روحانی ترقی کی راہ کا روڑا سمجھتے تھے اور ان سے دور ہو جانا ہی ان کی زندگی کا بھی معیار تھا۔ مگر سنیاسی اور تیاگ کے علاوہ بندشوں کے توڑنے کی اور کیا تدبیر ہے؟

بولے "مگر جب وہ سنیاس کو ڈھونگ کہتے ہیں تو خود کیوں سنیاس لیا ہے؟"

انھوں نے سنیاس کب لیا ہے صاحب؟ وہ تو کہتے ہیں کہ انسان کو اخیر اخیر تک کام کرتے رہنا چاہیئے۔ آزاد خیالی ان کی نصائح کی جان ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، آزاد خیالی کا مطلب کیا ہے؟"

سمجھ میں تو میری بھی کچھ نہیں آیا۔ اب کے آپ آیئے تو ان سے گفتگو ہو۔ وہ پریم کو، زندگی کو سچائی کہتے ہیں۔ اور اس کی ایسی عمدہ صراحت کرتے ہیں کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔"

"مس مالتی کو ان سے ملایا نہیں؟"

"آپ بھی مذاق کرتے ہیں۔ مالتی کو بھلا ان سے کیا ملاتا؟....."

بات ختم نہ ہوئی تھی کہ سامنے کی جھاڑی میں سرسراہٹ سُن کر وہ چونک پڑے اور جان بچانے کی غرض سے رائے صاحب کے پیچھے آ گئے۔ جھاڑی سے ایک تیندوا نکلا اور آہستہ آہستہ سامنے کی طرف چلا۔

رائے صاحب نے بندوق اٹھائی اور نشانہ لگانا چاہتے تھے کہ کھنانے کہا۔ "یہ کیا کرتے ہیں آپ؟ خواہ مخواہ اسے چھیڑ رہے ہیں۔ کہیں لوٹ پڑے تو؟"

"لوٹ کیا پڑے گا؟ وہیں ڈھیر ہو جائے گا۔"

تو مجھے اس ٹیلے پر چڑھ جانے دیجئے۔ میں شکار کا ایسا شائق نہیں۔"

تب کیا شکار کھیلنے چلے تھے؟

"شامت اور کیا؟"

رائے صاحب نے بندوق نیچی کر لی۔

بڑا بڑھیا شکار نکل گیا۔ ایسے موقعے کب ملتے ہیں؟"

میں تو اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ خطرناک مقام ہے۔"

ایک آدھ شکار تو مار لینے دیجئے۔ خالی ہاتھ لوٹتے شرم آتی ہے۔"

"آپ مجھے مہربانی کر کے موٹر تک پہنچا دیجئے، پھر چاہے آپ تیندوے کا شکار کریں یا چیتے کا۔"

"سچ آپ بڑے ڈرپوک ہیں مسٹر کھنا!"

"مفت اپنی جان خطرے میں ڈالنا بہادری نہیں ہے۔"

"اچھا تو آپ خوشی سے واپس جا سکتے ہیں۔"

"تنہا؟"

"راستہ بالکل صاف ہے۔"

"جی نہیں، آپ کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔"

رائے صاحب نے بہت سمجھایا مگر کھنا نے ایک نہ مانی۔ ڈر کے مارے ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس وقت اگر جھاڑی سے ایک گلہری بھی نکل آتی تو وہ چیخ مار کر گر پڑتے۔ بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی پسینہ سے تر بتر ہو گئے تھے۔ رائے صاحب کو مجبور ہو کر ان کے ساتھ لوٹنا پڑا۔ جب دونوں بڑی دور نکل آئے تو کھنا کے ہوش ٹھکانے ہوئے بولے خطرہ سے نہیں ڈرتا لیکن خطرہ مول لینا حماقت ہے۔"

"اجی جاؤ بھی، ذرا سا تیندوا دیکھ لیا تو جان نکل گئی۔"

میں شکار کھیلنا اس وقت کا رواج سمجھتا ہوں جب انسان حیوان تھا۔ اب اس وقت سے تہذیب بہت آگے بڑھ گئی ہے۔"

"میں مس مالتی سے آپ کی قلعی کھولوں گا۔"

"میں اہنسا کا ماننا شرم کی بات نہیں سمجھتا۔"

"اچھا تو یہ آپ کا اہنسا والا مسئلہ تھا؟ شاباش!"

کھنا نے غرور سے کہا: "جی ہاں، یہ میرا وہی مسئلہ تھا۔ آپ بدھ اور شنکر کے نام پر فخر کرتے ہیں اور بے زبان جانوروں کا خون کرتے ہیں۔ شرم آپ کو آنی چاہیئے نہ کہ مجھے۔"

کچھ دور تک دونوں پھر چپ چاپ چلتے رہے۔ کھنا بولے: "تو آپ کب تک آئیں گے؟ میں چاہتا ہوں کہ آپ پالیسی کا فارم آج ہی بھر دیں اور شکر مل کے حصّوں کا بھی۔ میرے پاس دونوں فارم موجود ہیں۔"

رائے صاحب نے متفکرانہ لہجے میں کہا: "ذرا سوچ لینے دیجئے۔"

"اس میں سوچنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

تیسری ٹولی خورشید اور ٹنخا کی تھی۔ خورشید کے لئے ماضی اور مستقبل سادہ کاغذ جیسا تھا۔ وہ حال میں رہتے تھے۔ نہ ماضی کا پچھتاوا تھا نہ مستقبل کی فکر۔ جو کچھ آگے آجاتا تھا اسی میں دل و جان سے لگ جاتے تھے۔ دوستوں کی جماعت میں وہ مذاق کے پتلے تھے۔ کونسل میں ان سے زیادہ حوصلہ مند ممبر کوئی نہ تھا۔ جس سوال کے پیچھے پڑ جاتے منسٹروں کو رُلا دیتے کسی کے ساتھ رُو رعایت کرنا نہ جانتے تھے۔ بیچ بیچ میں ہنسی بھی کرتے جاتے تھے۔ ان کے لئے آج زندگی کا دن تھا، کل کا پتہ نہیں۔ غصہ ور بھی ایسے کہ خم ٹھونک کر سامنے آجاتے تھے۔ انکسار کے آگے سجدہ کرتے تھے، مگر جہاں کسی نے شان دکھائی اور یہ ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے۔ نہ اپنا لینا یاد رکھتے تھے نہ دوسروں کا دینا۔ شراب و شاعری کا شوق تھا۔ عورت صرف تفریح کی چیز تھی۔

بہت دن ہوئے دل کا دیوالہ نکال چکے تھے۔

ٹنخا صاحب بڑے کاٹ بیچ کے آدمی تھے۔ سودا پٹانے میں معاملہ سلجھانے میں، اڑنگا لگانے میں، بالو سے تیل نکالنے میں، گلا دبانے میں اور دُم جھاڑ کر نکل جانے میں بڑے ہوشیار تھے۔ کہئے تو ریت میں ناؤ چلا دیں، پتھر پر دوب اگا دیں۔ تعلقداروں کو مہاجنوں سے قرض دلانا، نئی کمپنیاں کھولنا، چناؤ کے وقت امیدوار کھڑا کرنا، یہی سب ان کا کام تھا۔ خاص کر چناؤ کے وقت ان کی قسمت چمک اٹھتی تھی۔ کسی مال دار امیدوار کو کھڑا کرتے، دل و جان سے اس کا کام کرتے اور دس بیس ہزار بنا لیتے۔ جب کانگریس کا زور تھا تو کانگریسی امیدوار کے مددگار تھے جب فرقہ وارانہ جماعت کا زور ہوا تو ہندو سبھا کی طرف سے کام کرنے لگے، مگر اس الٹ پھیر کو ٹھیک ثابت کرنے کے لئے ان کے پاس ایسے دلائل تھے جن کی تردید نہ ہو سکتی تھی۔ شہر کے سب ہی رؤسا، سب ہی حکام سے ان کا یارانہ تھا۔ دل میں چاہے لوگ ان کے طریقے پسند نہ کریں مگر وہ ایسے منکسر مزاج تھے کہ کوئی ان کے منہ پر نہ کہہ سکتا تھا۔

مرزا خورشید نے رومال سے ماتھے کا پسینہ پوچھ کر کہا "آج تو شکار کھیلنے لائق دن نہیں ہے۔ آج تو کوئی مشاعرہ ہونا چاہیئے تھا۔"

وکیل صاحب نے تائید کی "جی ہاں، وہیں باغ میں بڑی بہار رہتی ہے۔"

ذرا دیر بعد ٹنخا نے معاملہ کی گفتگو شروع کی "اب کے چناؤ میں بڑے بڑے گل کھلیں گے۔ آپ کے لئے بھی مشکل ہو"

مرزا بے پروائی سے بولے "اب کے میں کھڑا ہی نہ ہوں گا"

ٹنخا نے پوچھا "کیوں؟"

"مفت کی ہائے ہائے میں کون پڑے؟ فائدہ ہی کیا؟ مجھے اب اس ڈموکریسی پر اعتقاد نہیں رہا۔ ذرا سا کام اور مہینوں کی بحث ہاں عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے اچھی بحث ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ ایک گورنر ہے۔ خواہ وہ ہندوستانی ہو یا انگریز، اس سے بحث نہیں۔ ایک انجن جس گاڑی کو بڑے مزے سے ہزاروں میل کھینچ لے جا سکتا ہے اسے دس ہزار آدمی بھی مل کر اتنی تیزی سے نہیں کھینچ سکتے۔ میں تو سارا تماشا دیکھ کر کونسل سے بیزار ہو گیا ہوں۔ میرا بس چلے تو کونسلوں میں آگ لگا دوں جسے ہم ڈموکریسی کہتے ہیں وہ اصل میں بڑے بڑے تاجروں اور زمینداروں کا راج ہے اور کچھ نہیں۔ چناؤ میں وہی بازی لے جاتا ہے جس کے پاس روپیہ ہے۔ روپئے کے زور سے اسے سب ہی آسانیاں مل جاتی ہیں۔ بڑے بڑے پنڈت، بڑے بڑے مولوی بڑے بڑے لکھنے اور بولنے والے، جو قلم اور زبان سے پبلک کو جدھر چاہیں موڑ دیں سب ہی سونے کے دیوتا کے پیروں پر ناک رگڑتے ہیں۔ میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ اب چناؤ کے پاس نہ جاؤں گا۔ میرا پروپیگنڈا اب ڈموکریسی کے خلاف ہو گا"

مرزا صاحب نے قرآن کی آیتوں سے ثابت کیا کہ قدیم زمانے کے بادشاہوں کا معیار کتنا بلند تھا۔ آج تو ہم ان کی طرف تاک بھی نہیں سکتے۔ ہماری آنکھوں میں چکا چوند آجائے گی۔ بادشاہ کو خزانے کی ایک کوڑی بھی نجی خرچ میں لانے کا اختیار نہ تھا۔ وہ کتابیں نقل کر کے کپڑے سی کر، لڑکوں کو پڑھا کر اپنا گذر کرتا تھا۔ مرزا نے ایسے بادشاہوں کی ایک طویل فہرست گنا دی۔ کہاں تو وہ رعایا پرور بادشاہ اور کہاں آج کل کے منسٹر لوگ جنھیں پانچ، چھ، سات، آٹھ ہزار ماہوار ملنا چاہیئے۔ یہ لوٹ، یہ ڈموکریسی؟

ہرنوں کا جھنڈ چرتا ہوا نظر آیا۔ مرزا کے چہرے پر شکار کا جوش چمک اٹھا۔ بندوق سنبھالی اور نشانہ مارا۔ ایک کالا ہرن گر پڑا۔ "وہ مارا!" اس مجنونانہ آواز کے ساتھ مرزا بھی بے تحاشا دوڑ پڑے۔ بالکل بچوں کی طرح اچھلتے کودتے اور تالیاں بجاتے ہوئے۔

پاس ہی ایک درخت پر ایک شخص لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ وہ بھی فوراً درخت سے اتر کر مرزا کے ساتھ دوڑا۔ ہرن کی گردن میں گولی لگی تھی۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے اور اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ لکڑہارے نے ہرن کو مغموم نگاہوں سے دیکھ کر کہا، "اچھا پٹھا تھا، من بھر سے کم نہ ہوگا، حکم ہو تو میں اٹھا کر پہنچا دوں۔"

مرزا کچھ بولے نہیں۔ وہ ہرن کی دو بھری آنکھوں کو دیکھ رہے تھے۔ ابھی ایک منٹ قبل اس میں زندگی تھی۔ ذرا سا پتا بھی کھڑکتا تو

کان کھڑے کر کے چوکڑیاں بھرتا ہوا نکل بھاگتا۔ اپنے ساتھیوں اور بال بچوں کے ساتھ خدا کی اگائی ہوئی گھاس چر رہا تھا مگر اب بے بس پڑا ہے۔ اس کی کھال ادھیڑ لو، اس کی بوٹیاں کر ڈالو، اس کا قیمہ بنا ڈالو، اسے خبر بھی نہ ہوگی۔ اس کی تفریحی زندگی میں جو کشش تھی، جو لطف تھا، وہ کیا اس بے جان لاش میں ہے؟ کتنا سڈول جسم تھا، کتنی پیاری آنکھیں، کتنا دل کش جلوہ! اس کی قلانچیں دل میں خوشی کی لہریں پیدا کر دیتی تھیں، اس کی چوکڑیوں کے ساتھ ہمارا دل بھی چوکڑیاں بھرنے لگتا تھا، اس کی جانداری اپنے ساتھ ہر جگہ زندگی سی بکھراتی چلی جاتی تھی..... جس طرح پھول اپنی خوشبو پھیلاتا ہے لیکن اب اسے دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔

لکڑہارے نے پوچھا کہاں پہنچانا ہوگا مالک؟ مجھے دو چار پیسے دے دینا۔"

مرزا صاحب جیسے دھیان سے چونک پڑے۔

بولے: "اچھا اٹھا لے۔ کہاں چلے گا؟"

"جہاں حکم ہو مالک۔"

"نہیں جہاں تیری مرضی ہو وہاں لے جا میں تجھے دیتا ہوں۔"

لکڑہارے نے مرزا کی طرف تعجب سے دیکھا۔ کانوں پر یقین نہ آیا بولا: "ارے نہیں مالک، ہجور (حضور) نے شکار کیا ہے، سو ہم کیسے کھالیں؟"

"نہیں نہیں، میں خوشی سے کہتا ہوں کہ تم اسے لے جاؤ۔ تمھارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"کوئی آدھا کوس ہوگا مالک۔"

تو میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔ دیکھوں گا کہ تمھارے بال بچے کیسے خوش ہوتے ہیں؟"

"اسے تو میں نہ لے جاؤں گا سرکار! آپ اتنی دور سے آئے اس کڑی دھوپ میں شکار کیا، میں کیسے اٹھالے جاؤں؟"

"اٹھا، اٹھا، دیر نہ کر۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ تو بھلا آدمی ہے۔"

لکڑہارے نے ڈرتے ڈرتے اور رہ رہ کر مرزا کے چہرے کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہ کہیں بگڑ نہ جائیں، ہرن کو اٹھایا۔ یکایک اس نے ہرن کو چھوڑ دیا اور کھڑا ہوکر بولا۔ "میں سمجھ گیا مالک، ہجور نے اس کی حلالی نہیں کی۔"

مرزا نے ہنس کر کہا۔ "بس بس تو نے خوب سمجھا، اب اٹھالے اور گھر چل۔"

مرزا صاحب مذہب کے اتنے پابند نہ تھے۔ انھوں نے دس سال سے نماز نہ پڑھی تھی۔ دو مہینے میں ایک دن پورا روزہ رکھ ڈالتے تھے، بالکل بلا کچھ کھائے پیئے۔ مگر لکڑہارے کو اس خیال سے جو تسلی ہوئی تھی کہ ہرن اب ان لوگوں کے کھانے کی چیز نہیں رہ گیا، اسے پھینکا نہ کرنا چاہیئے تھے۔ لکڑہارے نے ہلکے دل سے ہرن کو گردن پر رکھ لیا اور گھر کی طرف چلا۔ ٹنخا ابھی تک بے پروائی سے وہیں درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ دھوپ میں ہرن کے پاس جانے کی تکلیف کیوں گوارا کرتے؟ کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ معاملہ کیا ہے؟ لیکن جب لکڑہارے کو دوسری طرف جاتے دیکھا تو آکر مرزا

سے بولے "آپ ادھر کہاں جا رہے ہیں حضرت؟ کیا راستہ بھول گئے۔"

مرزا نے خطاوار کی طرح مسکرا کر کہا "میں نے شکار اس غریب آدمی کو دے دیا۔ اب ذرا اس کے گھر جا رہا ہوں۔ آپ بھی آیئے نا۔"

ٹنخا نے مرزا کو تعجب سے دیکھا اور بولے "آپ اپنے ہوش میں ہیں یا نہیں؟"

"کہہ نہیں سکتا، مجھے خود نہیں معلوم۔"

"شکار اسے کیوں دے دیا؟"

"اس لئے کہ اسے پا کر اس کو جتنی خوشی ہوگی اتنی مجھے یا آپ کو نہ ہوگی۔"

ٹنخا گھبرا کر بولے "جایئے! سوچا تھا کہ خوب کباب اڑائیں گے سو آپ نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ خیر۔ رائے صاحب اور مہتا کچھ نہ کچھ لائیں ہی گے، کوئی غم نہیں۔ میں اس چناؤ کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نہیں کھڑے ہونا چاہتے تو نہ سہی آپ کی جیسی مرضی، مگر آپ کو اس میں کیا تامل ہے کہ جو لوگ کھڑے ہو رہے ہیں ان سے اس کی اچھی قیمت وصول کی جائے۔ میں آپ سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آپ کسی پر بھید نہ کھلنے دیں کہ آپ کھڑے نہیں ہو رہے ہیں۔ رؤسا کے ووٹ تو سولہ آنے ان کی طرف ہیں، حکام بھی ان کے مددگار ہیں پھر بھی پبلک پر آپ کا جو اثر ہے اس سے وہ گھبرا رہے ہیں۔ آپ چاہیں تو آپ کو ان سے دس بیس ہزار روپئے محض یہ ظاہر کر دینے کے لئے مل سکتے ہیں کہ آپ ان کی خاطر بیٹھے جاتے ہیں ..... نہیں مجھے عرض کر لینے

دیجئے۔ اس معاملہ میں آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے۔ آپ بے فکر بیٹھے رہیئے۔ میں آپ کی طرف سے ایک مینی فسٹو نکال دوں گا، اور اسی شام کو آپ مجھ سے دس ہزار نقد وصول کر لیجئے۔"

مرزا صاحب نے ان کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا: "میں روپئے پر اور آپ پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

مسٹر ٹنخا نے کچھ بھی برا نہیں مانا، ماتھے پر شکن تک نہ آنے دی۔

مجھ پر آپ جتنی لعنتیں چاہیں بھیجیں مگر روپئے پر لعنت بھیج کر آپ اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔"

"میں ایسے روپئے کو حرام سمجھتا ہوں۔"

"آپ شریعت کے اتنے پابند تو نہیں ہیں؟"

"لوٹ کی کمائی کو حرام سمجھنے کے لئے شرع کے پابند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تو اس معاملے میں آپ اپنا فیصلہ تبدیل نہیں کر سکتے؟"

"جی نہیں۔"

"اچھی بات ہے، اسے جانے دیجئے۔ کسی بیمہ کمپنی کے ڈائرکٹر ہو جانے میں تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟ آپ کو کمپنی کا ایک حصہ بھی نہ خریدنا پڑے گا۔ آپ صرف اپنا نام دے دیجئے گا۔"

"جی نہیں، مجھے یہ بھی منظور نہیں ہے۔ میں کئی کمپنیوں کا ڈائرکٹر کئی کا مینیجنگ ایجنٹ، کئی کا چیئرمین تھا۔ دولت میرے پاؤں چومتی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ دولت سے آرام و تکلف کے کتنے سامان جمع کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ دولت انسان کو کتنا

خود غرض بنا دیتی ہے، کتنا عیش پسند، کتنا مکار اور کتنا بے غیرت!

وکیل صاحب کو پھر کوئی تجویز پیش کرنے کی جرأت نہ ہوئی مرزا صاحب کے دانشمند اور با اثر ہونے میں انھیں جو یقین تھا وہ بہت کم ہو گیا، ان کے لئے دولت ہی سب کچھ تھی اور ایسے شخص سے جو دولت کو ٹھکراتا ہو، ان کا کوئی میل نہ ہو سکتا تھا۔

لکڑہارا ہرن کو کندھے پر رکھے لپکا چلا جا رہا تھا۔ مرزا نے بھی قدم بڑھایا۔ مگر موٹے جسم والے ٹنخا صاحب پیچھے رہ گئے۔ انھوں نے پکارا "ذرا سنئے مرزا جی۔ آپ تو بھاگے جا رہے ہیں۔"

مرزا نے بلا رکے جواب دیا "وہ غریب بوجھ لئے کتنی تیزی سے چلا جا رہا ہے، ہم کیا اپنا بدن لے کر اس کے برابر نہیں چل سکتے؟"

لکڑہارے نے ہرن کو ایک ٹھنڈ پر اتار کر رکھ دیا اور دم لینے لگا۔

مرزا صاحب نے آکر پوچھا "تھک گئے کیوں؟"

لکڑہارے نے شرماتے ہوئے کہا "بہت بھاری ہے سرکار۔"

"تو لاؤ کچھ دور میں لے چلوں۔"

لکڑہارا ہنسا۔ مرزا ڈیل ڈول میں اس سے کہیں زیادہ اونچے اور موٹے تازے تھے، پھر بھی وہ دبلا پتلا آدمی ان کی اس بات پر ہنسا مرزا پر جیسے چابک پڑ گیا "تم ہنسے کیوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اسے نہیں اٹھا سکتا؟"

لکڑہارے نے گویا معافی مانگی "سرکار، آپ لوگ بڑے آدمی ہو بوجھ اٹھانا تو ہم جیسے مجوروں (مزدوروں) کا کام ہے۔"

"میں تمھارا دگنا جو ہوں۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے مالک۔"

مرزا کی مردانگی اپنی زیادہ توہین نہ سہ سکی۔ انھوں نے بڑھ کر ہرن کو گردن پر اٹھا لیا اور چل پڑے مگر مشکل سے پچاس قدم چلے ہوں گے کہ گردن پھٹنے لگی، پیر کانپنے لگے اور آنکھوں میں تتلیاں اڑنے لگیں کلیجہ مضبوط کیا اور کوئی بیس قدم پھر چلے کمبخت کہاں رہ گیا؟ جیسے اس لاش میں سیسہ بھر دیا گیا ہو ذرا مسٹر ٹنخا کی گردن پر رکھ دوں تو مزا آجائے۔ لیکن بوجھ اتاریں کیسے؟ دونوں اپنے دل میں کہیں گے کہ بڑی جوانمردی دکھانے چلے تھے، پچاس ہی قدم میں چیں بول گئے۔

لکڑہارے نے چٹکی لی "کہو مالک کیسے رنگ ڈھنگ ہیں؟ بہت ہلکا ہے نا؟"

مرزا کو بوجھ کچھ ہلکا معلوم ہونے لگا، بولے "اتنی دور تو لے ہی جاؤں گا جتنی دور تم لائے ہو۔"

"کئی دن گردن دکھے گی مالک۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں یوں پھولا ہوا ہوں؟"

"نہیں مالک، اب تو ایسا نہیں سمجھتا مُدا (لیکن) آپ حیران نہ ہوں۔ وہ چٹان ہے اس پر اتار دیجئے۔" "میں ابھی اسے اتنی ہی دور اور لے جا سکتا ہوں۔"

مگر یہ اچھا نہیں لگتا۔ کہ میں یونہی چلوں اور آپ لدے

رہیں۔"

مرزا صاحب نے چٹان پر ہرن کو اتار کر رکھ دیا۔ وکیل صاحب بھی آپہنچے۔ مرزا نے دانہ پھینکا۔ اب تو آپ کو بھی کچھ دور لے چلنا پڑے گا جناب!"

وکیل صاحب کی نگاہوں میں مرزا صاحب کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ بولے "معاف کیجئے، مجھے اپنی پہلوانی کا دعویٰ نہیں ہے۔"

"بہت بھاری ہے، سچ۔"

"اجی رہنے بھی دیجئے۔"

"آپ اگر اسے سو قدم لے چلیں تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ میرے سامنے جو تجویز رکھیں گے اسے منظور کر لوں گا۔"

"میں ان چقموں میں نہیں آتا۔"

"میں چقمہ نہیں دیتا ہوں واللہ! آپ جس حلقے سے کہیں گے کھڑا ہو جاؤں گا اور جب حکم دیں گے بیٹھ جاؤں گا۔ جس کمپنی کا ڈائرکٹر، ممبر گماشتہ، کنویسر جو کچھ کہئے گا بن جاؤں گا۔ بس سو قدم لے چلئے۔ میری تو ایسے ہی دوستوں سے نبھتی ہے۔ جو موقع پڑنے پر سب کچھ کر سکتے ہوں۔"

ٹنخا کا جی چلبلا اٹھا۔ مرزا اپنے قول کے پکے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہ تھا۔ ہرن کیا ایسا بہت بھاری ہوگا۔ آخر مرزا اتنی دور لے ہی تو آئے بہت زیادہ تھکے تو نہیں معلوم ہوتے۔ اگر انکار کرتے ہیں تو سنہرا موقع ہاتھ سے جاتا ہے، آخر ایسا کون پہاڑ ہے؟ بہت ہوگا چار پانچ پنسیری ہوگا دو چار دن گردن ہی تو دکھے گی۔ جیب میں روپے ہوں

تو تھوڑی سی بیماری سکھ کی چیز ہے۔

"سو قدم کی رہی۔"

"ہاں سو قدم میں گنتا چلوں گا۔"

"دیکھئے نکل نہ جائیے گا۔"

"نکل جانے والے پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

ٹنخا نے جوتے کا فیتہ پھر سے باندھا، کوٹ اتار کر لکڑ ہارے کو دیا۔ پتلون اوپر چڑھایا، رومال سے منہ پوچھا اور اس طرح ہرن کو دیکھا جیسے اوکھلی میں سر ڈالنے جا رہے ہوں۔ پھر ہرن کو اٹھا کر گردن پر رکھنے کی کوشش کی، دو تین بار زور لگانے پر لاش گردن پر تو آ گئی مگر گردن نہ اٹھ سکی کمر جھک گئی، ہانپ اٹھے اور لاش زمین پر ٹیکنے ہی والے تھے کہ مرزا نے انھیں سہارا دے کر آگے بڑھایا۔

ٹنخا نے ایک قدم اس طرح اٹھایا جیسے دلدل میں چل رہے ہوں۔ مرزا نے بڑھاوا دیا "شاباش میرے شیر! واہ، واہ۔"

ٹنخا نے ایک قدم اور رکھا۔ معلوم ہوا، گردن ٹوٹی جاتی ہے۔

"مار لیا میدان! شاباش! بیتا رہ پیٹھے!"

ٹنخا دو قدم اور بڑھے۔ آنکھیں نکلی پڑتی ہیں۔

بس ایک بار اور زور مارو دوست! سو قدم کی شرط غلط، پچاس ہی قدم رہی!"

وکیل صاحب کا بُرا حال تھا۔ وہ بے جان ہرن شیر کی طرح انھیں دبوچے ہوئے ان کے دل کا خون پی رہا تھا، ساری طاقت جواب دے چکی تھی۔ صرف لالچ کی آہنی شہتیر کی طرح چھت کو سنبھالے

ہوئے تھا۔ ایک سے پچیس ہزار تک گونی تھی۔ مگر بالآخر وہ شہتیر بھی جواب دے گیا۔ لالچ کی کمر ٹوٹ گئی، آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا سر پر چکر آیا اور وہ شکار گردن پر لئے ہوئے پتھریلی زمین پر گر پڑے۔ مرزا نے فوراً اٹھایا اور اپنے رومال سے ہوا کرتے ہوئے ان کی پیٹھ ٹھونکی۔

"زور تو یار تم نے خوب مارا مگر قسمت ہی کھوٹی ہے۔"

ٹخنے ہاپنتے ہوئے ایک لمبا سانس کھینچ کر کہا "آپ نے آج میری جان ہی لے لی تھی۔ دو من سے کم نہ ہوگا سسر!"

مرزا نے ہنستے ہوئے کہا "لیکن بھائی جان! میں بھی تو اتنی دور اٹھا کر لایا ہی تھا۔"

وکیل صاحب نے خوشامد کرنی شروع کی "مجھے تو آپ کی فرمائش پوری کرنی تھی۔ آپ کو تماشا دیکھنا تھا، وہ آپ نے دیکھ لیا۔ اب آپ کو اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا!"

"آپ نے معاہدہ کب پورا کیا؟"

"کوشش تو جان توڑ کر کی۔"

"اس کی سند نہیں۔"

لکڑہارے نے پھر اس کو اٹھا لیا تھا اور بھاگا چلا جا رہا تھا۔ وہ دکھا دینا چاہتا تھا کہ تم لوگوں نے کانکھ کانکھ کر اسے دس قدم اٹھا لیا تو یہ نہ سمجھو کہ پاس ہو گئے۔ اس میدان میں تم سے کمزور ہونے پر بھی آگے ہی رہوں گا۔ ہاں کاگد (کاغذ) تم چاہے جتنا کالا کرو اور جھوٹے مقدمے چاہے جتنے بناؤ۔

ایک نالہ ملا جس میں بہت تھوڑا پانی تھا۔ نالے کے اُس پار ٹیلے پر

ایک چھوٹا سا پانچ چھ گھروں کا پُروہ تھا اور کئی لڑکے املی کے درخت کے نیچے کھیل رہے تھے۔ لکڑہارے کو دیکھ کر سب نے دوڑتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا اور لگے پوچھنے: "کس نے مارا؟ باپو! کیسے مارا؟ کہاں مارا؟ کیسے گولی لگی؟ اس کے کیوں لگی اور ہرنوں کے کیوں نہ لگی؟" لکڑہارے ہوں ہوں، کرتا املی کے نیچے پہنچا اور ہرن کو اتار کر قریب کی جھونپڑی سے دونوں اصحاب کے لئے چارپائی لینے دوڑا، اس کے چاروں لڑکوں اور لڑکیوں نے شکار کو اپنے چارج میں لے لیا اور دوسرے لڑکوں کو بھگا دینے کی کوشش کرنے لگے۔ سب سے چھوٹے لڑکے نے کہا: "ہمارا ہے۔"

اس کی بڑی بہن نے جو چودہ پندرہ برس کی تھی، مہمانوں کی طرف دیکھ کر چھوٹے بھائی کو ڈانٹا: "چپ! نہیں سپاہی پکڑ لے جائیگا۔"

مرزا نے لڑکے کو چھیڑا: "تمھارا نہیں ہے، ہمارا ہے۔"

لڑکے نے ہرن پر سوار ہو کر اپنا قبضہ ثابت کر دیا اور بولا: "باپو تو لائے ہیں۔"

بہن نے سکھایا: "کہدے بھیا کہ تمھارا ہے۔"

ان بچوں کی ماں بکریوں کے لئے پتیاں توڑ رہی تھی۔ دونئے بھلے مانسوں کو دیکھ کر اس نے ذرا سا گھونگھٹ نکال لیا اور شرمائی کہ اس کی ساڑی کتنی میلی، کتنی پھٹی اور اٹینگی ہے وہ اس بھیس میں مہمانوں کے سامنے کیسے جائے؟ اور گئے بغیر کام نہیں چلنے کا۔ پانی وانی دینا ہوگا۔

ابھی دوپہر ہونے میں کچھ کسر تھی۔ مگر مرزا نے اسی گاؤں میں دوپہر

مٹنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ گاؤں کے آدمیوں کو جمع کیا، شراب آئی، شکار پکا، قریب بازار سے گھی اور میدہ منگایا اور گاؤں بھر کو دعوت دی۔ چھوٹے، بڑے عورت، مرد سب ہی نے دعوت اڑائی۔ مردوں نے خوب شراب پی اور مست ہو کر شام تک گاتے رہے۔ اور مرزا صاحب بچوں کے ساتھ بچہ شرابیوں کے ساتھ شرابی، بوڑھوں کے ساتھ بوڑھے اور جوانوں کے ساتھ جوان بنے ہوئے تھے۔ اتنی ہی دیر میں گاؤں بھر سے ان کا اتنا گہرا میل جول ہو گیا تھا، گویا وہیں کے باشندے ہوں۔ لڑکے تو ان پر لدے پڑتے تھے، کوئی ان کی پھندنے دار ٹوپی سر پر رکھے لیتا تھا، کوئی ان کی رائفل کندھے پر رکھ کر اکڑتا ہوا چلتا تھا اور کوئی ان کی رسٹ واچ کھول کر اپنی کلائی پر باندھے لیتا تھا۔ مرزا نے خود دیسی شراب خوب پی اور جھوم جھوم کر جنگلی آدمیوں کی طرح گاتے رہے۔

جب یہ لوگ شام کے وقت یہاں سے رخصت ہوئے تو گاؤں بھر کے عورت مرد انھیں بڑی دور تک پہنچنے گئے۔ کئی تو رو رہے تھے! ایسی خوش قسمتی کا موقع ان غریبوں کی زندگی میں شاید اوّل ہی مرتبہ آیا ہو کہ کسی شکاری نے ان سب کی ضیافت کی ہو۔ ضرور یہ کوئی راجہ نواب ہے، نہیں تو اتنا دریا دل اور کس کا ہوتا ہے؟ ان کے درشن کا ہی کو ہوں گے۔

کچھ دور چلنے کے بعد مرزا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولے: "بیچارے کتنے خوش تھے! کاش میری زندگی میں ایسے مواقع روز آتے! آج کا دن بڑا مبارک تھا۔"

شخانے بے رخی سے کہا: "آپ کے لئے مبارک ہوگا، میرے

لئے منحوس ہی نکلا۔ مطلب کی کوئی بات نہ ہوئی۔ تمام دن جنگلوں اور پہاڑوں کی خاک چھانئے کے بعد اپنا سا منہ لئے لوٹے جاتے ہیں۔"

مرزا نے رکھائی سے کہا: "مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔"

دونوں جب برگد کے نیچے پہنچے تو دونوں ٹولیاں لوٹ چکی تھیں۔ مہتا منہ لٹکائے ہوئے تھے، مالتی اداس سی الگ بیٹھی تھی جو نئی بات تھی رائے صاحب اور کھنہ دونوں بھوکے ہی رہ گئے تھے اور کسی کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ وکیل صاحب اس لئے غمگین تھے کہ مرزا نے ان کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ تنہا مرزا صاحب خوش تھے اور وہ خوشی روحانی تھی۔